اسلام کا بین الاقوامی قانون

[درج ذیل مقالہ دراصل امام محمد بن حسن شیبانیؒ کی مشہور و معروف کتاب "السیر الکبیر" کے تبصرہ و تعارف پر مشتمل ہے جو مصر کے ماہوار رسالہ "المجلۃ" بابت جولائی ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا ہے۔ مقالہ کی اہمیت و ندرت کے پیش نظر ہم قارئین "ترجمان القرآن" کے لئے اسے اردو میں منتقل کر کے شائع کر رہے ہیں۔ مقالہ کے مصنف ڈاکٹر عبدالغنی حسن ہیں جو المجلہ میں عموماً دینی و تاریخی مضامین لکھتے رہتے ہیں۔ ع ح]

اسلام کے بین الاقوامی قانون پر سب سے پہلی کتاب اور اس کا سبب تالیف اسلام کے بین الاقوامی قانون پر سب سے پہلی جو کتاب عالم وجود میں آئی ہے۔ وہ امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد امام محمدؒ کی السیر الکبیر ہے۔ اس کتاب کا ظہور دراصل "طیش" کا شرمندۂ احسان ہے طیش بلاشبہ ایک ناپسندیدہ صفت ہے۔ لیکن بعض اوقات اللہ تعالیٰ ناپسندیدہ چیز کے بطن سے خیر کثیر برآمد کرتا ہے۔ خیال فرمائیے۔ ایک مسلمان فقیہ دوسرے مسلمان فقیہ کے ایسے الفاظ پر طیش میں آجاتا ہے جو مؤخر الذکر کی طرف سے اوّل الذکر کے حق میں تنقیص کے انداز میں کہے جاتے ہیں لیکن یہ طیش یا غصہ جذبات اس کے اندر ذاتی کینہ یا حسد یا اسی قبیل کے دیگر سفلی جذبات مشتعل نہیں کرتی بلکہ اس کے اندر عمل بالخیر کا داعیہ تیز تر کر دیتی ہے اور اسے ایک ایسی مضبوط اور ٹھوس کتاب کی تصنیف پر لگا دیتی ہے جس سے وہ عالم مذکور کو اپنے الفاظ واپس لینے پر مجبور کر سکے چنانچہ وہ اس کتاب کی تصنیف میں ہمہ تن منہمک ہو جاتا ہے اور آخر کار جامعیت و خوبی کے ہر ممکن تصور کے ساتھ یہ کتاب منظر عام پر آجاتی ہے جس میں اسلامی نقطۂ نظر کے تحت اسلام کے فلسفۂ جنگ اور تعلقات خارجہ پر روشنی ڈالی جاتی ہے اور اس موضوع کی ہر گرہ کو خوش اسلوبی سے سلجھایا جاتا ہے۔ ایک طرف یہ تمام بحث اسلامی حدود کے اندر پوری آزادیٔ فکر و نظر پر مبنی ہوتی ہے اور دوسری طرف ہر بات

کا استناد اللہ کی کتاب اور رسولؐ کی سنت سے کیا جاتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ حسن تدبر، وسعتِ نظر، وفورِ علم اور عمق تفقہ کا بے کراں بحر مصروفِ تلاطم ہے۔

دراصل "السیر الکبیر" سے پہلے امام محمدؒ نے "السیر الصغیر" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی تھی جس میں مختصراً تعلقاتِ خارجہ، جنگ اور صلح و امان کے بارے میں اسلامی احکام بیان کئے تھے۔ یہ کتابچہ (الصغیر) جب شام کے نامور محدث امام اوزاعیؒ کے ہاتھ لگا تو امام موصوف نے دریافت فرمایا: "یہ کس کی تصنیف ہے؟" لوگوں نے بتایا: "یہ محمد بن حسن عراقی کا نتیجۂ فکر ہے" اس پر امام اوزاعی نے کہا۔ اہلِ عراق کو اس موضوع سے کیا واسطہ؟ ان کو سیر (جنگ کے مسائل) کے بارے میں کچھ علم نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے غزوات کا رُخ شام و حجاز کی طرف رہا ہے۔ عراق کی طرف نہیں تھا۔ یہ ملک بعد میں فتح ہوا ہے۔" امام اوزاعی کے یہ الفاظ جب امام محمد بن حسن عراقی کے کانوں تک پہنچے تو آپ بہت متاثر ہوئے اور سیر کے موضوع پر ایک مفصل اور جامع کتاب لکھنے کا عزم کر لیا۔ اور جب تک اس کتاب سے فارغ نہیں ہو گئے اور کسی شغل کی طرف دھیان نہیں دیا "السیر الکبیر" آپ کی اسی دوسری کاوش کا نام ہے۔

"السیر الکبیر" کا بھی ایک نسخہ امام اوزاعی رحمہ اللہ تک پہنچ گیا۔ امام محترم نے جب اس کا مطالعہ کیا اور اس کے تمام مسائل کا جائزہ لیا تو مصنف کی جہدِ عظیم اور طبعِ رسا پر انگشت بدنداں رہ گئے اور فرمایا: "اگر کتاب میں جا بجا احادیث سے استناد نہ کیا گیا ہوتا تو میں کہہ اٹھتا کہ مصنف اس علم (بین الاقوامی قانون) کا خود واضع ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مصنف کی نگاہ کو سمتِ حق پر رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بالکل بجا ہے کہ فوق کل ذی علم علیم (ہر ذی علم پر ایک بالاتر صاحبِ علم ہے)۔"

رومی قانون دانوں پر سبقت امام محمد بن حسن شیبانیؒ دوسری صدی ہجری کے علماء میں سے ہیں اور امام ابو حنیفہؒ کے نامور شاگردوں میں سے ہیں۔ چار سال تک اپنے استاذ امام کی صحبت

میں رہے ہیں اور پھر امام ابو یوسف سے انہوں نے فقہ کی تکمیل کی ہے۔ امام محمدؒ کی یہ کتاب بلا اختلاف اسلام کے قانون صلح و جنگ اور تعلقاتِ خارجہ کا مایۂ ناز مرجع سمجھی جاتی ہے بلکہ یہ اپنے موضوع پر دنیا میں سب سے پہلی تصنیف شمار ہوتی ہے۔ اس سے پہلے بین الاقوامی قانون پر کسی کتاب کا سراغ نہیں ملتا۔ رومی مصنفین جنہیں قانون کا استاذ سمجھا جاتا ہے ان کی فہرستِ تصانیف بھی اس موضوع سے خالی ہے۔ درحقیقت سترہویں صدی سے قبل فرنگی قانون سازوں کو اس موضوع کی اہمیت کا احساس نہیں ہوا۔ سترہویں صدی میں یعنی امام محمد بن حسن شیبانی کے کئی صدی بعد، گروٹیوس نے بین الاقوامی قانون پر ایک کتاب لکھی جسے اہلِ مغرب کے نزدیک دنیائے قانون میں بین الاقوامی قانون کا نقطۂ آغاز قرار دیا جاتا ہے۔

السیر الکبیر کی شرح | "السیر الکبیر" کو عالمِ وجود میں آئے ہوئے جب تقریباً تین صدیاں گزر گئیں تو اس کتاب کی عزت و توقیر میں مزید اضافہ یہ ہوا کہ ملتِ اسلامیہ کے ایک جلیل القدر عالم نے اس کی شرح املاء کی۔ یہ عالم شمس الائمہ محمدؒ بن احمد سرخسی ہیں۔ جو اپنی اہم تصنیف "المبسوط" کی وجہ سے غیر معمولی شہرت رکھتے ہیں۔ شمس الائمہ سرخسی نے السیر الکبیر کی یہ شرح کسی دارالعلوم یا کسی کتب خانہ میں بیٹھ کر نہیں کی ہے بلکہ یہ انہوں نے محض اپنے حافظہ کی مدد سے قید خانے کی تاریکیوں میں املاء کرائی ہے۔

شارح کی داستان عزیمت و ابتلاء | السیر الکبیر کی شرح کا تعارف اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا۔ جب تک شارح — شمس الائمہ سرخسی — کے حوالۂ زنداں ہونے کا پس منظر نہ معلوم ہو جائے۔ پانچویں صدی ہجری میں ماوراء النہر میں خاقان کی حکومت تھی۔ خاقان نے ایک آزاد شدہ لونڈی سے عدت کی مدت ختم ہونے سے پہلے ہی نکاح کر لیا۔ خاقان اس پر غیر معمولی حد تک فریفتہ ہو چکا تھا، اس لئے اسے زمانۂ عدت کا انتظار شاق گزر رہا تھا۔ شمس الائمہ کو جب ایک شرعی حکم کی پامالی کی خبر پہنچی تو انہوں نے سلطان کی اس حرکت پر سخت گرفت کی

اور اسے شریعت کی خلاف ورزی پر محمول کیا۔ خاقان نے اگر اتباع ھوئی کا مظاہرہ کیا تھا تو ایک عبقری عالم اسے کیونکر برداشت کر سکتا ہے۔ شمس الائمہ نے بلا خوفِ ملامت اس نکاح کے از روئے شریعت حرام ہونے کا فتویٰ دے دیا۔ ہوا پرست حکمران کی طرف سے اس جرأت کا جواب یہ تھا کہ فقہ اسلامی کے اس رکن رکین اور علم و فضل کے اس بحرِ ذخار کو ۱۵ سال کے لئے اوزجند کے اندھے کنوئیں میں ڈال دیا گیا[1]۔ لیکن تشنگانِ علم کا رجوع امام موصوف کی طرف برابر جاری رہا۔ شاگردوں کا حلقہ کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھ جاتا اور اندر سے امام محترم کے علم و عرفان کا بحرِ بے کراں موجزن ہو جاتا ہے اور جو کچھ وہ بولتے جاتے اسے شاگرد لکھتے جاتے فقہ حنفی کی جلیل القدر کتاب "المبسوط" کی پندرہ جلدیں اور السیر الکبیر کی مفصل و جامع شرح اسی قید کے زمانے کی تصنیفات ہیں۔ اللہ تعالیٰ مصنف اور شارح دونوں کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔

اس لحاظ سے "السیر الکبیر" صرف جہاد بالسیف کا مضمون ہی پیش نہیں کرتی بلکہ یہ کتاب اپنے پس منظر میں جہاد بالنفس، جہاد بالعلم اور جہاد بالحق کی متعدد داستانیں بھی رکھتی ہے۔ کتاب کے الفاظ تو صرف یہ بتاتے ہیں کہ اسلامی حکومت کو بیرونی ممالک سے اور غیر مسلم رعایا سے تعلقات استوار کرنے کے لیے کن کن اصولوں کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ مگر ایک طرف صاحبِ کتاب کی روح بین السطور میں یہ پیغام دے رہی ہے کہ جذبات کی گرمی کو آلۂ شر بنانے کے بجائے آلۂ خیر بھی بنایا جا سکتا ہے۔ اور دوسری طرف شارح کتاب کا زندۂ جاوید کارنامہ علمائے حق کو یہ درس دے رہا ہے کہ ایک علم بردار شریعت

---

[1] بعض کتابوں میں یہ مذکور ہے کہ خاقان نے کچھ ظالمانہ ٹیکس عوام پر عائد کر دیئے تھے۔ جو ان کی استطاعت سے بڑھ کر تھے۔ شمس الائمہ سرخسی نے ان ظالمانہ ٹیکسوں کے خلاف فتوے دے دیا۔ جبر کی پیشانی پر شکن آ گئے۔ اور ہمدردیٔ عوام کی پاداش میں شمس الائمہ کی زندگی کا طویل اور اہم حصہ ایک جُبِّ عمیق کی نذر کر دیا۔ یہ دونوں واقعات بجائے خود ثقہ روایات پر مبنی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ شمس الائمہ نے یہ دونوں "جرم" کئے تھے (مترجم)

کی شان یہ ہونی چاہیئے کہ اگر اربابِ اقتدار اللہ کی شریعت کو اپنی اھواء و خواہشات پر قربان کر رہے ہوں تو منقار زیر پر رکھنے کے بجائے حق بات کو کھلم کھلا بیان کر دینا چاہیئے، خواہ اس کی پاداش میں اندھے کنوؤں کی نذر ہونا پڑے، خواہ تختۂ دار پر کھینچ جانا پڑے۔ ؎

یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہر یک دانہ
حق گوئی و بے باکی اے ہمتِ مردانہ

کتاب کا قبولِ عام "السیّر الکبیر" اور اس کی شرح ہر دور میں ملّتِ اسلامی کے اہتمام و شغف کا مرکز رہی ہے۔ "السیّر الکبیر" جب لکھی گئی تھی تو ہارون الرشید نے اسے دیکھ کر نہ صرف اظہارِ مسرت کیا بلکہ اسے اپنے عہد کا قابلِ فخر تحفہ قرار دیا اور اپنے دونوں لڑکوں (امین اور مامون) کو اس کتاب کے سماع کے لئے امام محمدؒ کی مجلس میں حاضر ہوتے رہنے کا حکم دیا۔ بعد میں اس کتاب کو دولتِ عثمانیہ کے خلفاء نے سلطان محمود کے عہد سے ممالک یورپ کے خلاف اپنی طویل جنگوں میں احکام جہاد کی اساس اور مرجع قرار دیئے رکھا اور امان و صلح کے تمام معاملات اسی کتاب کی روشنی میں طے ہوتے رہے۔ السیّر الکبیر پر کچھ عرصہ ایسا بھی گزرا ہے جب کہ یہ ملّتِ اسلامی کی نگاہوں سے اوجھل رہی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو حیاتِ ثانیہ بخشی اور ایک مسلمان فقیہ عبدالحمید بدوی کو اس طرف راغب کیا۔ موصوف نے اس کا صحیح ترین نسخہ تلاش کرنے کے بعد اس کی اشاعت کا اہتمام کیا[1]۔ چنانچہ اس کوشش کے نتیجے میں بین الاقوامی قانون سے دلچسپی رکھنے والے اہلِ مغرب کی ایک جماعت نے بھی اپنی توجہات کو اس پر مرکوز کیا اور اس کتاب کے مطالعہ و تحقیق کے لئے گوٹنگن (جرمنی) میں مصنفِ کتاب کی نسبت سے ایک انجمن وجود میں آگئی۔ جس کا نام "انجمن شیبانی برائے انٹرنیشنل لا" رکھا گیا اور ڈاکٹر عبدالحمید بدوی اس انجمن کے صدر منتخب ہوئے۔ اب عرب لیگ کے شعبہ مخطوطات کے ڈائرکٹر جناب صلاح الدین المنجد کی کوششوں سے یہ کتاب تحقیق و ترتیب

---

[1] اس سے پہلے حیدرآباد کا دائرۃ المعارف اسے چار جلدوں میں چھاپ چکا ہے عبدالحمید بدوی کی کوشش اس کے کئی سال بعد کی ہے (مترجم)

کے نئے لباس میں ملبوس ہو کر اشاعت پذیر ہوئی ہے۔ اس نئے ایڈیشن کی خوبی یہ ہے کہ اس کا موازنہ بیروت کی امریکن یونیورسٹی کے مخطوطے سے بھی کر لیا گیا ہے جو اس کی شرح کا قدیم ترین مخطوطہ ہے۔ شمس الائمہ کی وفات ۴۹۰ھ میں ہوئی ہے اور مذکورہ مخطوطہ ۶۳۱ھ میں لکھا گیا ہے۔ عرب لیگ اور اس کے فاضل ڈائرکٹر دونوں اس قابل قدر خدمت پر پوری ملتِ اسلامی کی طرف سے شکر گزاری کے مستحق ہیں۔

کتاب کے مباحث "السیر الکبیر" میں امام محمدؒ نے جہاد و غزا، سرحدی تحفظات، امان، معاہداتِ صلح، فسخ معاہدات کے احکام، اموالِ غنائم، جنگی قیدیوں کے احکام، مفتوح علاقوں کے احکام، ثالثی ٹریبونل، اسلحۂ جنگ کے بارے میں شرعی ہدایات، جہاد اسلامی کے حدود و آداب اور اسی قبیل کے دوسرے سینکڑوں مسائل پر روشنی ڈالی ہے اور انہیں بڑی قانونی حکمت، دقتِ نظر اور معنی خیز ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے۔ قرآن و حدیث کے دائرے میں رہتے ہوئے فقہ کے نقطۂ نظر کو اسی اسلوب اور مزاج کے ساتھ واضح کیا ہے جو عراقی اسکول کی خصوصیات میں سے ہے۔

شہادت اور حقوق العباد آغاز کتاب میں سب سے پہلے قاری جانثار راہِ حق کی قدر و منزلت سے آگاہ ہوگا اور اسے حضرت ابو قتادہ کی یہ روایت ملے گی کہ:

> "ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ ارشاد فرمایا۔ اللہ کی حمد و ثناء کے بعد جہاد کا ذکر کیا اور اس میں آپؐ نے فرائض کے ماسوا کسی چیز کو جہاد سے افضل نہ بتایا۔ ایک آدمی نے اٹھ کر عرض کی: یا رسول اللہ! جو شخص اللہ کی راہ میں مارا جاتا ہے کیا یہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کافی دیر تک خاموش رہے۔ ہمیں خیال ہوا کہ آپؐ پر وحی نازل ہو رہی ہے۔ پھر آپ نے فرمایا: ہاں۔ جو شخص اللہ کی راہ میں اس حال میں مارا گیا کہ وہ خالص اللہ کی خوشنودی کے لئے نکلا تھا اور اس نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا، اور نہ (بہ نیت فرار) پشت دکھائی

بلکہ آگے بڑھتا رہا۔ تو اس کی شہادت تمام گناہوں کے لئے کفارہ ہوگی۔ بجز قرض کے کیونکہ قرض کے معاملے میں اس سے بہرحال باز پرس ہوگی"

شارح کتاب امام سرخسی نے مذکورہ حدیث کی، ایک دوسری مشہور حدیث سے توثیق کر دی ہے "السیف محاء للذنوب الا الدین" تلوار گناہوں کو بالکل صاف کر دیتی ہے بجز قرض کے، شریعت اسلامی میں حقوق العباد کی جو اہمیت اور تاکید پائی جاتی ہے، شارح ممدوح نے ایک فقیہ کے نقطۂ نظر سے اس کو مزید نمایاں کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ "شہید اتنا بڑا درجہ حاصل کرنے کے بعد بھی قرض کے متعلق اللہ کی باز پرس سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ شریعت بندوں کے معاملات کو درست کرنے میں کس قدر اعتناء برتتی ہے۔"

بحری جنگ کی افضلیت امام محمد بحری جنگ کے متعلق توضیح کرتے ہیں: "دوسرے غزوات کی بہ نسبت بحری جنگ میں زیادہ اجر و ثواب پایا جاتا ہے" اس پر شارح رقم فرماتے ہیں۔ "یہ نیت جہاد جہاز یا کشتی پر سوار ہو جانا ہی بڑا افضل عمل ہے۔ کیوں کہ جہاد کی یہ نوعیت زیادہ کٹھن اور زیادہ خطرناک ہے۔ اس صورت میں مجاہد سمندر میں داخل ہوتے ہی اپنی جان کو مرضی الٰہی کے سپرد کر دیتا ہے۔ اس لئے گناہوں کے کفارہ میں شہید کو جو درجہ حاصل ہوتا ہے وہ بحری مجاہد کو محض سمندر میں داخل ہونے سے مل جاتا ہے" چونکہ جہاد کی خاطر بحری سفر کا جواز ثابت ہے۔ اس لیے شارح حج اور تجارت کی خاطر بھی اس سفر کو جائز قرار دیتے ہیں۔

جنگ میں معمر لوگوں کیساتھ سلوک کی نوعیت جنگ میں معمر لوگوں کو قتل کرنے کے متعلق امام محمد یہ رائے بیان کرتے ہیں کہ اگر وہ خود برسرپیکار نہ ہوں یا وہ جنگ کے بارے میں اپنی فکر و رائے سے مدد نہ دیتے ہوں تو انہیں قتل نہیں کیا جائے گا۔ البتہ اگر وہ خود تلوار لے کر نکلیں یا جنگ میں مددگار ہوں تو انہیں قتل کیا جائے گا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے درید بن صمہ کے ساتھ یہی برتاؤ کیا تھا۔ یہ شخص بوڑھا کھوسٹ تھا۔ لیکن جنگ کا پرزور حامی تھا، اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قتل کر دینے کا حکم دے دیا تھا۔

دراصل محاربِ دشمن کی طویل العمری اور اسکے حق میں رحم طلب جذبات سے قطع نظر شریعت نے اسلام اور مسلمانوں کی مجموعی مصلحت کو مقدم رکھا ہے۔ ظاہر ہے "اسلامی ریاست" کی بہبود و فلاح ہر دوسری چیز پر فوقیت رکھتی ہے۔ اس لئے فقہ اسلامی کے عراقی اسکول کی نگاہ میں مصلحت عامہ کو مصلحت خاصہ پر ترجیح حاصل ہے۔ امام محمد نے اپنی مذکورہ بالا رائے میں اسی اصول کو اختیار کیا ہے۔ دشمن کے کھیتوں، نخلستانوں اور تاکستانوں کو کاٹنے کے بارے میں بھی عراقی اسکول جو رائے رکھتا ہے۔ اس سے اس اسکول کی فقہی بصیرت کے پہلو اُجاگر ہوتے ہیں۔ مثلاً امام اوزاعی۔ جو اصحاب ظواہر میں سے ہیں۔ نص ظاہری سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کے لیے دارالحرب کے اندر کوئی ایسا کام کرنا جائز نہیں ہے جو تخریب کی تعریف میں آتا ہو، اس لیئے کہ تخریب فساد ہے اور اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ لیکن عراقی اسکول کے جلیل القدر نمائندے امام سرخسی اسے جائز قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں: جب اسلام نے دشمنوں کا زور توڑنے کے لیے قتل نفوس تک کی اجازت دی ہے حالانکہ نفوس انسانی سے بڑھ کر کوئی چیز محترم نہیں ہے۔ تو اُن سے کمتر اشیاء مثلاً عمارات کو مسمار کرنا اور درختوں کو اکھاڑنا تو بدرجہ اولیٰ جائز ہونا چاہیئے۔"

جنگ کے آداب و احکام اسلام نے مصلحت عمومی کے تحت ہی دورانِ جنگ باآواز بلند پکارنا مکروہ قرار دیا ہے الّا یہ کہ بلند آہنگی خود لشکر اسلام کے لیے مفید اور ولولہ انگیز ثابت ہو رہی ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مواقع پر آواز بلند کرنے کو ناپسند فرمایا ہے: ایک تلاوتِ قرآن کے وقت، دوسرے جنائز میں اور تیسرے دشمن پر حملہ کرتے وقت۔ لیکن بایں ہمہ آپؐ خود مقابلۂ دشمن کے وقت حضرت ابو دجانہ کو برانگیختہ کیا کرتے تھے کہ وہ اپنی گرجدار اور پُرہیبت آواز کو بلند کریں۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے: "جنگ میں ابو دجانہ کی آواز پورے دستے کا کام دیتی ہے۔"

امام محمد جنگ کے دوران "قتلِ خطا" اور "قتلِ خطاناً" کا نہایت باریک اور لطیف

فرق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: اگر رات کے وقت مسلمان فوج کے دو دستے باہم متصادم ہو گئے، دونوں میں سے ہر ایک نے فریقِ مقابل کو مشرکوں کا دستہ سمجھا، چنانچہ انہوں نے آپس میں تلوار چلائی اور کچھ لوگ قتل ہو گئے۔ پھر انہیں حقیقت حال کا علم ہو گیا تو ایسی صورت میں مقتولین کے سلسلہ میں ان پر کوئی دیت اور کفارہ نہ ہوگا۔ امام موصوف نے اپنی اس رائے کی بنیاد حضرت جابر بن عبداللہ کی اس روایت پر قائم کی ہے:

"غزوۂ خندق میں ایک مرتبہ رات کے وقت رسول اللہ صلی اللہ وسلم کے لشکر میں سے دو دستے گردش کے لیے نکلے اور رات کی تاریکی میں دونوں کی آپس میں مڈبھیڑ ہو گئی۔ ان میں سے ایک دوسرے کو بالکل نہ پہچان سکا بلکہ ہر ایک کا یہی خیال تھا کہ فریقِ مقابل دشمن گروہ میں سے ہے۔ اس تصادم میں کچھ زخمی ہو گئے اور کچھ مارے گئے۔ پھر ان میں سے ہر ایک نے اسلامی شعار کا نعرہ مارا تو دونوں فریق یکایک لڑائی سے رک گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس واقعہ کا ذکر کیا گیا تو آپ نے فرمایا:

"تمہارے زخم اللہ کی راہ میں ہیں اور جو تم میں سے مارے گئے ہیں وہ شہید ہیں"۔

البتہ اگر مسلمانوں کا کوئی گروہ مشرکین سے برسرپیکار تھا اور ایک مسلمان نے دوسرے مسلمان کو مشرک سمجھ کر قتل کر دیا، یا اس نے تیر پھینکا مگر وہ مشرک کو نہ لگا بلکہ کسی مسلمان کو جا پیوست ہوا اور وہ مر گیا تو اس صورت میں اس شخص پر دیت بھی ہوگی اور کفارہ بھی۔ ان دونوں حالتوں میں نہایت باریک فرق ہے۔ امام سرخسی اسی باریک فرق کو یوں بے نقاب کرتے ہیں کہ پہلی حالت میں مسلمانوں کے دونوں دستوں میں سے ہر ایک نے اپنی جائز مدافعت کی۔ بے شک ان میں سے ہر ایک دستہ دوسرے دستے کو حملہ آور سمجھتا تھا اور خود اپنی مدافعت میں لڑ رہا تھا۔ اس مدافعت کا وہ شرعاً مکلف ہے۔ لہٰذا یہ مدافعانہ کارروائی موجبِ دیت و کفارہ نہ ہوگی۔ دوسری حالت میں یہ قتل خطا کی واضح صورت ہے۔ اور

قتلِ خطا میں دیت و کفارہ بروئے نص واجب ہے"۔

مسلمان مجاہدین کو میدان جنگ میں بعض ایسی مشکلات پیش آجاتی ہیں جن کے بارے میں اس جامع کتاب کے اندر اطمینان بخش حل اور واضح جواب مل جاتا ہے۔ مسلمان سپاہی دشمن فوج کے مقتولین کے سر کاٹ کر اپنے افسروں اور حکمرانوں کے پاس اگرلائیں تو کیا شرعاً یہ درست ہوگا؟۔ امام محمد نے اس قضیہ پر روشنی ڈالتے ہوئے عُقبہ بن عامر جُھنی رضی اللہ عنہ کا واقعہ ذکر کیا ہے۔ عقبہ بن عامر ایک غزوے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس "نیاق البطریق" کا سر کاٹ لائے۔ آپؓ نے اسے سخت ناپسند کیا۔ عرض کیا گیا: "اے خلیفۂ رسول! یہ لوگ ہمارے ساتھ بھی یہی سلوک کرتے ہیں"۔ خلیفۂ اوّل نے فرمایا: "کیا ہم بھی فارس و روم کی ڈگر پر چلنا شروع کر دیں؟ آئندہ میرے پاس کسی کا سر نہ لایا جائے۔ صرف خط لکھ دینا اور خبر بھیج دینا کافی ہے"۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: "یہ تم لوگوں نے زیادتی کی ہے اور اپنی حد سے صریح تجاوز کیا ہے"۔ شارح ممدوح اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ "بعض علماء نے خلیفۂ اوّل کے ظاہری الفاظ سے تمسّک کیا ہے اور کہا ہے کہ دشمنوں کے سر کاٹ کر حکام کو پیش کرنا حلال نہیں ہے۔ کیونکہ یہ میت ہے اور میت کو سڑاند سے بچانے کے لیے فوراً دفن کر دینا چاہیئے۔ نیز سروں کا کاٹنا مُثلہ ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مُثلہ سے منع فرمایا ہے خواہ وہ باؤلے کتے کی لاش ہی کیوں نہ ہو۔ نیز حضرت ابوبکرؓ کی وضاحت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ جاہلیّت کا فعل ہے اور فارس و روم کے طریقہ کی پیروی ہے"۔ لیکن شارح ممدوح خود اپنی اور اپنے ہم مسلک علماء کی رائے بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ہمارے اکثر مشائخ رحمہم اللہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر مقتول مشرکین کا کوئی بڑا سرغنہ ہو یا ان کا کوئی سرکردہ جنگ آزما ہو اور اس کا سر کاٹ کر لانے میں مشرکین کو آتشِ غیظ میں جلانا یا اہلِ اسلام کے دلوں کو ٹھنڈا کرنا مقصود ہو تو ایسی صورت میں کوئی

حرج نہیں ہے۔" امام سرخسی اس مسلک کا استدلال ابوجہل کے واقعہ سے کرتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ غزوۂ بدر میں اس ہٹ دھرم مشرک کا سر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے اور آپؐ کے سامنے لاکر ڈال دیا اور عرض کیا: یہ آپ کے دشمن ابوجہل کا سر ہے۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھ کر فرمایا: "اللہ اکبر، یہ میرا فرعون اور میری امت کا فرعون تھا۔ اس کی شرانگیزی مجھ پر اور میری امت پر موسیٰ اور ان کی امت پر فرعونِ مصر کی شرانگیزی سے زیادہ تھی۔" الغرض آپ نے نہ اس فعل سے منع فرمایا اور نہ ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

جنگی تدابیر اسلحہ اور شہسواری کے باب میں امام محمد اور امام سرخسی نے ایسا کوئی پہلو ترک نہیں کیا جو اس موضوع سے تعلق رکھتا تھا۔ دونوں حضرات نے اس موضوع کو زیادہ سے زیادہ جامع اور کامل بنانے کی کوشش کی ہے۔ صاحبؒ "السیر الکبیر" روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے اہل لشکر کو لکھا کہ "دشمن کی سرزمین میں اپنے ناخنوں کو زیادہ سے زیادہ بڑھاؤ، یہ بھی ایک ہتھیار ہے۔ اگرچہ ناخن ترشوانا سننِ فطرت میں سے ہے لیکن دارالحرب میں مجاہدین کے لیے ان کا بڑھانا مستحب ہے۔" شارح سرخسی نے جنگ میں ناخن بڑھانے کی حکمت پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے بیان کیا ہے: جب کسی مسلمان سپاہی کے ہاتھ سے ہتھیار گر جائے اور دشمن سر پر آپہنچے تو مسلمان سپاہی ناخنوں کی مدد سے اپنی مدافعت کر سکتا ہے۔ یہ وہی صورت ہے جو مونچھوں کے بارے میں اختیار کی جاتی ہے۔ مونچھیں کترانا سنّت ہے لیکن غازی کے لیے دارالحرب میں مونچھوں کو بڑھانا مستحب ہے تاکہ دشمن کے دل اس سے خوف زدہ ہوں اور مسلمانوں کا دبدبہ قائم ہو۔" موجودہ دور میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے اور میدانِ جنگ کے اندر ہر ملک کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کے سپاہی ایسی ہیئت میں نمودار ہوں کہ انہیں دیکھ کر دشمن کے دل مرعوب و مغلوب ہوں۔ لیکن فوج کے وہ یونٹ جو برسرِ جنگ نہیں ہوتے اُن میں یہ تدبیر اختیار نہیں کی جاتی بلکہ انہیں نفاست اور

صفائی کا پورا لحاظ رکھنا چاہیئے۔ امام محمد اور امام سرخسی کے بیانات سے ہم یہ استنباط کر سکتے ہیں کہ ہر وہ اسلحہ جو جنگ میں فوج کے لیے باعثِ نصرت ہو سکتا ہو اس کا استعمال ضروری ہے خواہ وہ فطری ذوق کے خلاف ہو۔ ناخن کاٹنا فطرتِ سلیم کا تقاضا ہے لیکن جنگی استعمال کے لیئے ان کو بڑھانا مستحسن قرار دیا گیا ہے۔

جنگ میں وہ امور بھی جائز ہو جاتے ہیں جو عام حالات میں جائز نہیں ہوتے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ مبارک ہے "جنگ ایک چال ہے"۔ امام سرخسی نے اس ارشادِ نبوی پر مفصل کلام کیا ہے۔ موصوف اس سے استدلال کرتے ہیں کہ "مجاہد اگر ہنگامِ قتال اپنے حریف کو دھوکہ دیتا ہے تو اس میں کوئی ممانعت نہیں ہے اور نہ ایسی کوئی چال غداری شمار ہوگی بعض علماء مذکورہ حدیث کے ظاہری الفاظ کی بنا پر کہتے ہیں: قتال میں جھوٹ بولنے کی بھی اجازت ہے۔ ان کا مزید استدلال یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جھوٹ بولنا درست نہیں ہے مگر تین صورتوں میں: دو آدمیوں میں صلح کرانے کے لیے، قتال کے وقت، اور مرد کو اپنی بیوی کو راضی کرنے کے لیے"۔ لیکن ہمارا مسلک یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں کذب سے مراد کذب محض نہیں ہے۔ کیونکہ کذب محض کسی حالت میں بھی جائز نہیں ہے بلکہ آپ کی مراد توریہ اور ذو معنی کلام کا استعمال ہے۔ اس کی نظیر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کذبات ثلاثہ والی حدیث میں ملتی ہے۔ اس حدیث میں بھی کذبات سے مراد توریہ ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کذب محض کے ارتکاب سے پاک ہوتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے کہ ذو معنی کلام سے انسان کذب محض کے ارتکاب سے بچ جاتا ہے"۔

امام محمد نے جنگی چالوں کا مفصل جائزہ لیتے وقت اپنے حیرت انگیز تخلیقی ذہن کا ثبوت دیا ہے۔ مثلاً وہ بتاتے ہیں کہ ایک جنگی چال یہ بھی ہے کہ مجاہد اپنے مبارز سے کسی ایسی بات کا ذکر کرے جو امر واقع نہ ہو یعنی زبان پر کچھ اور ہو اور دل میں کچھ اور۔ جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے غزوۂ خندق میں کیا تھا۔ حضرت علیؓ کو جب عمرو بن عبد وُدّ نے دعوتِ مبارزت

دی تو حضرت علیؓ نے کہا: کیا تو نے یہ عہد نہیں کیا تھا کہ تو میرے مقابلے کے لیے اپنے سوا کسی اور سے مدد طلب نہیں کرے گا؟ یہ کون لوگ ہیں جنہیں تو بُلا لایا ہے؟" عمرو بن عبد وُدّ نے حیران ہو کر پیچھے مڑ کر دیکھا تو حضرت علیؓ نے یکایک اس کی پنڈلیوں پر تلوار کا وار کیا اور اس کی دونوں ٹانگیں کاٹ کر رکھ دیں۔ حضرت علیؓ کی یہ نہایت کامیاب چال تھی۔ اور اُسی قبیل سے تھی جو جنگوں کے اندر جائز ہُوا کرتی ہے۔ امام محمد نے اس نوعیّت کی مثالوں کا ایک اچھا خاصا مجموعہ مرتّب کر دیا ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ "یہ جنگی حربے ہیں ان کے استعمال میں کوئی مضایقہ نہیں ہے"۔

مخادعت اور دھوکہ دہی کا طریقہ دورانِ جنگ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے اور خاتمہ پر بھی، لیکن اگر معاملہ امان تک پہنچ جائے تو مسلمان سپاہ اپنے معاہدے پر کاربند رہنے کی مکلّف ہے۔ اور اگر امام مسلمین کسی دشمن قوم کو امان دے دیتا ہے اور پھر اُسے امان منسوخ کر دینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو وہ دشمن کو اطلاع دے کر ہی امان کو منسوخ کر سکتا ہے۔ نیز اگر امان کی مہلت گزر جائے تو مسلمانوں کو اختیار ہے چاہے وہ اس کی تجدید کر دیں اور چاہے منسوخ کر دیں۔

مصنف رحمہ اللہ نے امان کے باب میں جن طُرفہ واقعات کو بیان کیا ہے ان میں سے ایک ہُرمزان فارسی جسے مسلمانوں نے گرفتار کر لیا تھا، کا مکالمہ ہے۔ ہُرمزان کو جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس لایا گیا تو حضرت عمرؓ نے ہُرمزان سے کہا: "اب کہو کیا کہتے ہو"۔ ہرمزان نے پوچھا: "کیا زندہ انسان کی سی بات چیت کروں یا مردہ کی سی؟" حضرت عمرؓ نے فرمایا: "زندوں کی سی بات چیت کرو"۔ ہُرمزان بولا: ہم اور تم دونوں جاہلیّت کی گود میں تھے۔ نہ ہمارا کوئی دین تھا اور نہ تمہارا۔ ہم لوگ تم عربوں کو کتّوں کے برابر سمجھا کرتے تھے۔ جب اللہ نے تمہیں دین سے سرفراز کیا اور تمہارے اندر ایک رسول کو مبعوث کیا تو ہم نے تمہاری اطاعت سے انکار کیا"۔ حضرت عمرؓ نے کہا: "کیا تو ہمارے ہاتھوں میں اسیر ہو کر بھی ایسی باتیں کرتا ہے؟"

پھر آپ نے حکم دیا: "اس کی گردن اڑا دو۔" ہرمزان بول اٹھا: "کیا تمہارے نبیؐ کی یہی تعلیم ہے کہ تم پہلے ایک اسیر کو پناہ دے دو اور پھر اس کو قتل کر ڈالو؟" حضرت عمرؓ نے کہا: "میں نے کب تجھے امان دی ہے؟" ہرمزان نے بتایا: "آپ نے مجھے کہا کہ زندہ انسان کی طرح بات چیت کر دو۔ مگر جسے جان کی امان نہ ہو وہ تو زندوں میں شمار ہی نہیں ہوتا۔" اس پر حضرت عمرؓ فوراً متنبہ ہوئے اور کہنے لگے: "اس پر خدا کی مار، اس نے ہم سے امان حاصل کر لی اور ہمیں خبر بھی نہیں ہوئی۔"

علی ہذا القیاس یہ کتاب تمام بین الاقوامی مسائل و قوانین کا ایک نہایت جامع اور حکمت آمیز دفتر ہے۔ اس کا تازہ ایڈیشن ان تمام اغلاط سے پاک ہے جو آج سے ۴۴ سال قبل حیدرآباد سے شائع ہونے والے ایڈیشن میں پائی جاتی ہیں۔

ماہنامہ **مشعلِ راہ** کراچی

فکر و نظر کی تاریکیوں میں اجالوں کا سفیر بن کر افق صحافت پر پوری شان سے نمودار ہو رہا ہے۔

زیر ادارت

خورشید احمد ایم۔ اے

محمود فاروقی

قیمت فی پرچہ پچاس پیسے ——— سالانہ چندہ: چھ روپے

مینیجر ماہنامہ "مشعلِ راہ" آرام باغ روڈ۔ کراچی

(تفصیلی اعلان کا انتظار فرمائیں)